مختار صدیقی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

حمیرا اشفاق*

Abstract:

Mukhtar Siddiqui was a poet of multiple genius.He used each word of its verses by jugding its meolidous worth and lines as if a painter.Some of his poems portray the image of a dancing girl by its form and style.His selection of words,modes of applying musical archestra and philosophical approach with a soft and humble tone made him a singular poet.In this article the author has not only analysed Mukhtar Siddiqui's total poetical works but high lighted the delicasies,which may transform a creation,a coposition into art form.

مختار صدیقی (پ: ۱۹۱۷ء و: ۱۹۷۲ء) جدید اُردو شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری بالخصوص جدید اردو نظم نے اپنے منفرد خدوخال کی بدولت بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کر لی۔ان کے ہیئتی تجربات نے ان کے شاعرانہ آہنگ کو نئی صورت عطا کی۔مختار صدیقی کی انفرادیت صرف تجرباتی اور خارجی نوعیت کی نہیں بلکہ ان کی شاعری میں فنی پختگی اس قدر رہے کہ وہ لفظوں کے نبض شناس دکھائی دیتے ہیں۔ان کے موضوعات میں عصری شعور اپنی پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ان کے الفاظ شعر میں ڈھلتے ہوئے کبھی ڈرامائیت پیدا کرنے لگتے ہیں تو کبھی موسیقی کے راگوں پر محور قصاں ہو جاتے ہیں لیکن ان الفاظ کو سانچوں میں ڈھالتے ہوئے وہ اپنے عہد کے سیاسی و بین الاقوامی حالات سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں،ان کا فن تخیل کی نامعلوم گھاٹیوں میں سرگرداں ہونے کی بجائے حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس حقیقت پسندانہ رویے کے باوجود وہ ادب کی روح کو پامال نہیں ہونے دیتے۔ان کی شاعری،ادبی کی لطافتوں اور حقیقت کا حسین امتزاج ہے۔ن م راشد ان کی فنی پختگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''وہ ایک طرح سے 'درسی' شاعر ہے۔درسی سے میری مراد 'کتابی' یا 'مدرسی' نہیں بلکہ وہ شاعر جس کی ذہنی پختگی،جس کا اندازِ نظر اور اظہارِ خیال کا طریقہ استادانہ یا معتبرانہ ہو۔موضوعِ عشق

* اُستاد شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ہو یا سیاست ہو یا تصوّف، اس کے بیان کے لیے الفاظ کا انتخاب اوران کا دروبست ایسا ہو کہ انسان اس میں نوعمری کی نارسائی کا کوئی سُراغ نہ پا سکے۔ خیالات میں وہ بزرگانہ عفّت ہو کہ ہوا وہوس کا شائبہ تک نہ ہو۔‘‘(۱)

مختار صدیقی کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے دو یعنی ’’منزل شب‘‘ اور ’’سی حرفی‘‘ تو ان کی حیات میں ہی منظرِ عام پر آ گئے تھے جبکہ تیسرا شعری مجموعہ ’’آ ثار‘‘ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے کی کاوشوں سے اشاعت کے مراحل سے گزرا۔ مختار کی شاعری ارتقائی مراحل میں غمِ ہستی سے نکل کر غمِ دہر کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں ہیئتوں کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی گہرا تنوع موجود ہے۔ کبھی وہ ماضی کی بازیافت کرتے ہیں تو کبھی بازیافتہ عورت کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کر کے اس کے دُکھ کا احاطہ کرتے ہیں۔ پھر معاملات دنیا آہستہ آہستہ ان کی نظر میں وسعت کھونے لگے اور وہ کائنات کے گہرے رازوں کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے اور آخر کار تصوّف کے دامن میں جا پناہ ڈھونڈی۔ یوں ان کے موضوعات تصوّف کے پر پیچ راہوں سے بآسانی گزرتے چلے گئے۔

منزلِ شب کی شاعرانہ انفرادیت

’’منزلِ شب‘‘ مختار صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ ہے لیکن ہیئت، اسلوب اور موضوعات کا انتخاب، اس مجموعے کے خالق کی فنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس شعری مجموعے میں زندگی کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس میں لاکھوں، ہزاروں سالوں کی مدفون تہذیبیں بھی زندہ ہو جاتی ہیں اور عصر حاضر کی بے حسی بھی۔ اس مجموعے کے آغاز میں ’’پشنوازنئے‘‘ کے نام سے انہوں نے اپنے خیالات کا مدلّل اظہار کیا ہے جس میں انہوں نے نظریات کی جنگ کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ان کا خیال ہے کہ ادب کو زندگی کا عکاس اور جمالیاتی قدروں کا پاسدار ہونا چاہیے۔ وہ ’’ادب برائے زندگی‘‘ اور ’’ادب برائے ادب‘‘ کے نظریوں کو متضاد نہیں سمجھتے۔ وہ ادب کو نہ تو تاریخی دستاویز بنا دینا چاہتے ہیں اور نہ ہی وقت کے تقاضوں کا ترجمان بننا۔ اس ساری بحث میں وہ اپنا مُدعا یہ بتاتے ہیں کہ اس عہد میں ہر شخص سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی نظریاتی وابستگی کا اظہار کرے لیکن وہ شاعری میں ابہام و کنایات کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ’’یہ زمانہ وضاحت اور تشریح کا ہے، رمز و ایما کا نہیں......اب ہر چیز سخن ہے، جو بات ماورائے سخن، کبھی سمجھی اور مانی جاتی تھی اب مشتبہ قرار پاتی ہے۔‘‘

مختار صدیقی نے اپنے فن کے آغاز میں ہی اپنے لیے معیارات کا انتخاب کر لیا اور ابلاغ اور فن دونوں کو دست و گریباں نہیں ہونے دیا۔ کلاسیکیت اور جدّت کا امتزاج بھی انہی کا خاصہ ہے۔ وہ کبھی میرؔ کے پیرو بن کر

ابھرتے ہیں تو کبھی سلطان باہو کے طرز پر ''سی حرفی'' کے روپ میں منعکس ہوتے ہیں لیکن روایت میں رہ کر جدّت اختیار کرنے کی کامیاب کوشش ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ محمد صفدر میر اس ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''......مختار کا اسلوب اسے روایت پرست قاریوں کے لیے شاید زیادہ قابل قبول بناتا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بہت ہی ذاتی اور Intimate تجربات کو ایک کلاسیکی نعت اور پیرائے میں بیان کرنے کی یہ قدرت مختار صدیقی کے علاوہ کسی جدید شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔''(۲)

''منزلِ شب'' کے آغاز میں ہی مختار صدیقی نے اپنا ''تصورِ شعر'' واضح کر دیا کہ وہ شاعری کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں، یہی تصورِ شعر حلقہ اربابِ ذوق کا داخلی مزاج بھی ہے۔ وہ فن کو شخصی ہونے پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ انسان کے تجربات ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پنہاں خلش بن کر اعتراف کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں لیکن فن کے شخصی ہونے کے لیے مختار صدیقی اصول وضع کرتے ہیں کہ:

''......دل کا کرب لفظوں میں لانے کے لیے بصیرت اور خلوص، دو اہم شرطیں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی بدولت ہی ہر ذاتی تأثر یا انفرادی مشاہدہ، فرد اور تخصیص کی تنگنائے سے نکل کر آفاقیت کی بیکرانی میں سماتا ہے......فن و ادب یہاں پہنچ کر اظہار اور ابلاغ دونوں کا امتزاج بنتے ہیں۔''(۳)

مختار صدیقی کی اپنی شاعری، ''منزلِ شب'' سے ''سی حرفی'' تک اور پھر ''سی حرفی'' سے ''آثار'' تک تینوں منزلوں میں ذاتی تجربات اور عصری شعور کا حسین امتزاج نظر آتی ہے۔ انہوں نے فن کو وہبی اور اکتسابی دونوں مراحل سے گزارا ہے۔ ان کی فنی ریاضت، انہیں نت نئے تجربات سے گزارتی ہے اور انہیں ''جدید کلاسیک'' شاعر بنا دیتی ہے۔

کلاسیکی موسیقی سے مختار صدیقی کی گہری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سروں کو ان کے راگوں کی کیفیات کے مطابق منظوم کیا ہے۔ انہوں نے ''منزلِ شب'' میں اصوات کے زیر و بم کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالا ہی نہیں بلکہ ان کے زیرِ اثر ابھرنے والی کیفیات کو بھی ابھارا ہے۔ وہ خود اس ذیل میں اپنی نظموں کے پس منظر کو واضح کرتے ہیں کہ:

''......راگوں پر باقی نظموں میں، ان راگوں کے بنیادی جذبے یا تأثر (اس) کو ہی نظموں کا اصل موضوع رکھا ہے۔ مثلاً 'ایمن' کا بنیادی تأثر ایک غیر مختتم فراق کا ہے۔ 'درباری' میں کسی صاحب اقتدار کا شکوہ اور اپنی بندگی و وفاداری ہے اور ان دونوں باتوں کی گہرائی اور گیرائی کا رس ہے۔ 'چھایا' ہجر و وصال کے عجیب و غریب آمیزوں سے مزیّن ہوتا ہے۔''(۴)

مختار صدیقی کی شعری تکنیکوں میں موسیقیت، راگوں سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ ڈرامائیت کا عنصر بھی

غالب ہے۔ وہ جب کسی عہد یا منظر نامے کو پیش کرتے ہیں تو کرداروں کے مکالماتی انداز اس عنصر کو اور بھی جامع بنا دیتے ہیں۔ اس کی جھلک ''منزلِ شب'' کی کئی نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ 'منزلِ شب' کو تین شہ سُرخیوں کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کے لیے شب تاب، سدا رنگ اور بوئے رفتہ کے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے کے موضوعات مختار صدیقی کے عصری شعور کی واضح دلیل ہیں بلکہ نظم ''بازیافتہ''، ''نورِ سحر کہاں ہے اگر شام غم گئی'' وغیرہ ان کی ترقی پسندیت کی دلیل ہیں لیکن یہ ترقی پسندی ایک با قاعدہ نظریہ کی صورت اختیار نہیں کرتی بلکہ وہ سماج کا دُکھ محسوس کرتے ہوئے اپنے قلم کو روک نہیں پاتے۔ وہ اس دُکھ کو ملکی تناظر میں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح تک محسوس کرتے ہیں۔ اس ذیل میں ان کی نظم ''آخری بات'' اہم ہے جس میں انہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی پر دُکھ کا اظہار کیا ہے:

اور اب ٹینک اپاہج ہوئے تو پیں ٹھنڈی
پرشکستہ ہے فلک سیر تباہی کا جنوں
خون سے سینچی ہوئی خاک نے نگلیں فوجیں
جو ہر ذرہ نے یوں پھونکا ہے اپنا فسوں
ضامنِ امن اسے مانئے جیسے جیسے
''خون ہی ہم میں نہیں خون بہے گا کیسے

''منزلِ شب'' کے دوسرے حصے میں، ان کے ہاں فکری و فنی ارتقا اور بھی واضح شکل میں نظر آنے لگتا ہے:

> ''مختار کی کتاب کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنی......ایک بیسویں صدی کے مسلمان کی جو برعظیم ہند میں زندگی بسر کر رہا ہے، ذات اور کائنات اور دوسرے لوگوں اور حقیقتوں کے تعلق کے معانی سمجھ رہا ہے۔''(۵)

مختار صدیقی نے راگوں سے ابھرنے والے تأثرات، پر اپنی نظموں کی بنیاد رکھی ہے۔ اس حصے کی وضاحت وہ خود ہی ''منزلِ شب'' کے ابتدائیے میں کر دیتے ہیں جس سے ان کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس حصے کی تحریک انہیں اپنے دوست مشتاق احمد شیخ سے ملی۔ اس حصے میں ماضی کی بازیافت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی نظم ''خیال درباری'' اکبر کے دربار کا نقشہ پوری جزئیات کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ انہیں، دہلی میں ''فتح پور سیّدی'' جانے کا اتفاق ہوا تو یہ کھنڈرات انہیں ماضی کی داستان سنا گئے جسے انہوں نے نظم کی صورت میں ڈھالا۔ اس نظم کی تشکیل میں انہوں نے تان سین کے گائے ہوئے راگوں ''بلمپت ☆'' اور ''دُرت ☆'' کو استعمال کیا، اور ان بولوں سے بھی خیالات کشید کیے۔

''خیال درباری'' میں الفاظ کو ''بڑت'' کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔'' ☆بڑت'' موسیقی کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے تین کہہ کر پیچھے مڑنا اور پھر گانا۔ بند ملاحظہ ہو جس میں یہ التزام احسن طریق پر کیا گیا ہے:

روشنی تیز ہوئی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی فانوسوں کی اور شب کی دلہن
روشنی تیز ہوئی، شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی

''منزلِ شب'' کا تیسرا حصہ ''بُوئے رفتہ'' غزلیات اور طویل نظم ''موہن جوداڑو اور ہڑپہ'' پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے آغاز میں میؔر کے اشعار درج ہیں جس میں میؔر نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔ رنگ میؔر کا اثر، مختار صدیقی کی غزلیات میں جھلکتا ہے، وہی سوز وگداز اور داخلی کیفیات کا بیان ان کے کلام کی بھی نمایاں خصوصیات بنتی ہیں۔ اس کا اظہار ان کے اپنے ایک شعر سے یوں ہوتا ہے:

؎ ساتھ جنابِ نظر کے پھر سے، بھایا رنگِ میؔر ہمیں
جانے وحشتِ دل اب ہم کو کون مقام پہ لائی ہے

؎ جن کی ہلکی گہری تلخی، خون میں رچ رچ جاتی ہے
جزوِ حیات بنانے پڑے ہیں وہ اشعارِ میر ہمیں

کلاسیکی استعاروں وتشبیہات کو انہوں نے فیضؔ کی طرح نئے معانی ومفاہیم دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کو اُسی کلاسیکی روایت کے پس منظر میں پیش کیا ہے لیکن اس طرز کو جس کامیابی سے انہوں نے برتا ہے اُس کی کامیاب جھلک، مختار صدیقی اور ناصر کاظمی کے علاوہ کسی اور جدید شاعر میں نظر نہیں آتی لیکن مختار صدیقی نے عصری تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ میؔر کے موضوعات اور مختار کے اندازِ بیان میں فرق کے لیے کئی اشعار بطور نمونہ درج کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

؎ ہم کو شاعر نہ کہو کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا (میؔر)

؎ آج غزل کی صورت میں، جو آپ کے سامنے آئے ہیں
کن جتنوں سے یہ خون کے قطرے اب تک پس انداز ہوئے (مختار صدیقؔی)

ے یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا (میرؔ)

ے آج کی بات نہیں ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
جوں توں رات گزاری، لیکن دن کو سوا بے حال ہوئے

مختار صدیقی کی غزلیات میں میرؔ کی سی سادگی، گداختگی اور نرمی پائی جاتی ہے۔ ''موہن جوداڑو'' اور ''ہڑپہ'' کے موضوعات پر لکھی گئی نظمیں، مختار کے تاریخی شعور کی عکاس ہیں۔ نظم ''موہن جوداڑو'' ایک ریڈیائی تمثیل ہے:

''یہ نظم انہوں نے اپنے کراچی کے قیام میں لکھی۔ اس کی ریڈیائی تشکیل کراچی کے سٹوڈیو میں ہوئی اور لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ریکارڈ کی گئی۔ مختار صدیقی کی آثار قدیمہ سے دلچسپی اقبال شناسی کا نتیجہ ہے۔''(۶)

پروفیسر فتح محمد ملک، اقبال سے مختار صدیقی کی گہری دلچسپی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''مختار صدیقی اقبال کے اندازِ فکر سے آشنا ہوئے تو آثارِ قدیمہ اور موسیقی پر نظمیں وجود میں آئیں۔ اقبال کے اندازِ فکر کو اپنا لینے کے بعد انہوں نے ''اب دیدہ و دل بیاباں ہیں'' کے عنوان سے طویل ڈرامائی نظم کہی۔''(۷)

''منزلِ شب'' میں شاعر نے ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ یہ ان کی ہندی تہذیب سے دلچسپی کا ثبوت ہے کیونکہ ان کی شاعری کا کینوس موہن جوداڑو، ہڑپہ اور قدیم ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے۔ ''منزلِ شب'' ان کی شعری حیثیت کو متعین کرنے میں بنیادی حوالہ ہے۔

نظم کے بندوں کو موسیقی کی اصطلاحوں پر قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً استھائی ☆، پھیلاؤ ☆، انترہ ☆ وغیرہ۔ خیال اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے یہ حصہ بہت عمدہ ہے۔ افضل پرویز صاحب جو مختار صدیقی کے قریبی دوستوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

''مشتاق احمد شیخ کی رہنمائی میں مختار نے راگوں پر نظمیں لکھیں۔ مختار بہت ذہین آدمی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ مجھے گھر پر ''شنکرہ راگ'' سنوایا جائے۔ ہم نے اس راگ کو گھر پر سنوانے کا اہتمام کیا جس کو مختار نے جذب کرایا اور ''خیال ایمن کلیان'' اور ''شنکرہ'' راگوں پر نظمیں لکھیں۔''(۸)

''کیدارا کا ایک روپ'' بھی راگوں پر مشتمل نظمیں ہیں۔ ''کیدارا کا ایک روپ'' میں چاندنی رات کا راگ وجہ تخلیق بنتا ہے۔ یہ تمام نظمیں، رس ☆، تاثر اور ڈرامائیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ''یہ نظمیں ایسے ''راگ''

ہیں جن میں فن موسیقی کو فن شعر کی قیود میں لا کر، لفظوں میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔"(۹)

"کیدارا کا ایک روپ" کے ایک بند میں تو سا، ما کی سروں یعنی ان آوازوں کا اہتمام کیا گیا ہے:

آج سب مبہم امنگیں، گنگ شکووں میں نہال
چاند نے چھپنا ہے، ارمانوں کے منہ سے یہ سوال:
ہم تو محرومی کی راہیں تکتے تکتے مر چلے
منتظر ہے کون؟ جاناں تم جو بن ٹھن کر چلے!
جاناں تم جو بن ٹھن کر چلے!

گیت اور سنگیت کا یہ خوبصورت سنگم مختار صدیقی کو اپنے ہمسفر شعراء میں ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔

سی حرفی: اُردو ادب کا اہم سنگِ میل

"سی حرفی" مختار صدیقی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ یہ ان کی زندگی میں ہی ۱۹۶۳ء میں شامل ہوا۔ "سی حرفی" ایک پنجابی صنف سخن ہے۔ اس میں حروف ابجد کی ترتیب سے تیس سے زیادہ قطعات لکھے جاتے ہیں۔ اس میں اخلاقی، مذہبی اور صوفیانہ خیالات کو موضوع بنایا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ دوسرے موضوعات زندگی کو بھی یہ اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مختار صدیقی، حضرت سلطان باہوؒ سے بے حد متأثر تھے حتیٰ کہ وہ ان سے روحانی ملاقاتوں کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سلطان باہوؒ کی عقیدت و محبت میں اس، صنفِ سخن کا انتخاب کیا۔ ن م راشد، مختار صدیقی کی "سی حرفی ☆" کو تصوف سے لگن کا نتیجہ تو قرار دیتے ہیں لیکن وہ اسے فارسی کی تصوفانہ روایت کی کڑی نہیں کہتے بلکہ وہ اسے پنجابی کی صوفیانہ روایت کی توسیع قرار دیتے ہیں:

> "اُسے فارسی کے صوفی شعراء کی طرح زندگی کی بے مائیگی اور لاحاصلی کا رونا نہیں بلکہ پنجابی شاعر کی طرح زندگی کی گہری آرزومندی ہے۔ گویا زندگی اس لیے عزیز ہے کہ وہ خود "سر سے تا بقدم آرزوئے یار ہے" فارسی شاعر نے زندگی کی بے ثباتی اور بے مرامی کا دلچسپ بہانہ بنا کر جس دریادلانہ خورد و نوش اور جس روزانہ بے باکی کی تعلیم دی ہے۔ اس سے پنجابی کا صوفی شاعر قطعی نا آشنا ہے۔"(۱۰)

مزید لکھتے ہیں کہ:

> "مختار صدیقی کی شاعری میں تصوّف ضرور ہے۔ تصوّف کا علم اور فلسفہ اور ذوق و شوق سبھی کچھ ہے۔ حتیٰ کہ کہیں کہیں تصوّف یا مذہب کی اصطلاحات کا تانا بانا بھی ہے لیکن اس کا عشق پنجاب کے صوفی شاعر کے عشق کی طرح توانا اور پختہ کار ہے۔"(۱۱)

''سی حرفی'' کے 'حرفِ آغاز' میں مختار صدیقی خود کو کوئی صوفی شاعر نہیں گردانتے بلکہ اس کتاب میں آنے والے موضوعاتِ تصوّف کو اس طرح سے دیکھتے ہیں:

> ''جہاں کہیں اس ''سی حرفی'' میں ایسے مضامین آ گئے ہیں جن کو آسانی کی خاطر، تصوّف کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے، وہ روایتی اور سنے سُنائے نہیں ہیں۔...... بلکہ یہ مضامین میرے تجربات کا ایک حصہ ہیں اور ان کا کوئی تعلق تصوّف کی اُن اعلام اور روایات سے نہیں جو مفت میں بدنام رہیں اور اب تک ہیں۔''(۱۲)

مختار صدیقی کی ''سی حرفی'' میں شامل موضوعاتِ نظم ان کی میلانِ طبع کا نتیجہ نظر آتے ہیں۔ اس میں پنجابی کی روایت کے تتبع میں اخلاقی مضامین یا محض تصوّف کا التزام نہیں کیا گیا۔ وہ ایک ہی ''حرف'' کے لیے ایک سے زیادہ ''قطعات'' کو جاتے ہیں جس کی وجہ وہ اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی وسعت بتاتے ہیں۔

خود کلامی کا عنصر مختار صدیقی کے فن میں اپنی فنی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی ذات کے بارے میں بھی فن میں اٹھنے والے سوالات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں:

چاک چلے ___ اور دَور سے اس کے خاک کے شام وسحر بدلیں!
چاک چلے ___ اور اس کے چلن سے، کوزہ گراں کی دُکاں چلے
چاک چلے ___ اور چال سے اس کی خاک کے صورت گر بدلیں
چاک کا دور، افلاک کی گردش، چاک چلے تو جہاں چلے

سی حرفی، میں ''خاک'' کے بارے میں قطعات جو درج کیے گئے ہیں ان میں ایسا فلسفہ کارفرما ہے جو قاری کو فنی وفکری دونوں سطحوں پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خاک کے فلسفے سے آگے بڑھتے ہوئے وہ خاک تنوں کا ذکر کرتے ہیں اور انسان کے عدم سے وجود میں آنے کی بات کو ایسے پیش کرتے ہیں کہ بات کی معنویت اور گہرائی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے:

خاک تنوں میں آنا پڑا تھا، جب اور جیسے، خدا لایا
جان سی شے یہ قالب پا کر، کیسی خاک سواد ہوئی!
میں تو یہاں کبھی آپ نہ آتا، اسی کا حکم بجا لایا
دادِ نعمت ہستی دوں ___ یا کہ دوں ___ بڑی بیدار ہوئی

ن م۔ راشد ج مختار صدیقی کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مختار، صوفیہ کے ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ'' کے تصور ہی کی کھینچ تان میں مبتلا ہے لیکن ایک تو مختار کے خیالات میں جو وسعت ہے وہ اپنی تکرار سے کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ دوسرے اگر صوفیہ کے خیالات کی کھینچ تان بھی ہو تو یہ محض کسی اور کی صدا کی گونج نہیں خود مختار کے اپنے شعور اور احساس کی ترجمانی اس میں کہیں زیادہ ہے۔''(۱۳)

مختار صدیقی عشق کی پیچ دار گھاٹیوں میں کبھی خدا کی تلاش میں بھٹکتے ہیں تو کبھی مجاز کی لیکن یہ دونوں کیفیات عشق کی نئی جہات متعین کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ان کی نظمیں ''حجاب نام'' اور ''سوزِ سخن'' دونوں جمالیاتی اثر قائم کرتی ہیں۔ ''حجاب نام'' سن جاناں کی تکرار صوتی آہنگ ابھارتی ہے اور معنویت کے اعتبار سے سوچ اور فکر کے نئے در وا کرتی ہے:

سُن جاناں: یہ پیار انوکھا ــــ جس کے اسیر آزاد
دونوں ہی آباد رہیں ــــــ اور دونوں ہی برباد!
سن جاناں: یہ پیار انوکھا، میں باندی تم سردار
تم بندے میں صاحب و مالک، میں ذرّہ، تم مختار!
سُن جاناں: میں پردہ سخن کا، عین سخن یہ لگن!
جس میں ہم تم دونوں برابر ــــ باقی باتیں فن!

محبت کو ایک اور جگہ یوں منظوم کرتے ہیں:

جان اور تن کے ربط سے بڑھ کر میرے لیے ہو تم جاناں
اب تم ہی ملو یا موت ہی آئے، راہیں تکنا کام ہوا

''سی حرفی'' میں مختار صدیقی کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں خیالات کا سلسلہ ایک رَو میں بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں کہیں ہیئت، تکنیک یا الفاظ کا گنجلک پن نظر نہیں آتا بلکہ سادہ سے اندازِ بیان میں فلسفے کی عمیق تہیں کھلتی چلی جاتی ہیں:

''اس طرح ایک آزاد تسلسل اور مخفی ربط پیدا ہو گیا۔ کوئی تجربہ یا مشاہدہ اپنے مختلف ادوار یا پہلوؤں کے ساتھ بھی ایک ہی حرف کے تحت نظم کرنا پڑا تا کہ اس میں تجربے کی یک جہتی قائم رہے۔''(۱۴)

''سی حرفی'' کا آغاز حمد، نعت، منقبت امیر علیہ السلام، منقبت سیّدالشہداء کے عنوان سے قطعات کی ہیئت میں ہوتا ہے۔ حروف ابجد کے اعتبار سے منطقی ترتیب ''آ'' سے شروع ہوتی ہے لیکن حرف ''آ'' کی ذیل میں مختلف عنوانات قائم کر کے ان میں ایک مخفی ربط اور تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ آگ: طلعت نار، آبیار: آب، آج ملے: وصال میں معنوی ربط میں بڑی عمدگی سے پیدا کیا گیا ہے۔ بظاہر آگ اور پانی نہ وصال اور ہجر یہ مجموعہ اضداد نظر آتے ہیں مگر جب ان کے باہمی تعلق کو جوڑیں تو آگ اور پانی کی صفاتی مطالعہ وسعت معنی کی گواہی دیتا ہے۔ آگ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ آگ جلاتی بھی ہے اور جلتی بھی ہے، یہی ہے جو کوہِ طور پر تو کبھی صدقِ خلیل میں نظر آتی ہے۔ یہی تپش یہی آگ ہی تو میدانِ کربلا میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ آگ میں 'نور' کی جھلک دیکھتے ہیں:

آگ اور خاک کا ربط عجب، کبھی لاگ رہی، کبھی میل رہا
آگ ہی خاک کو منکرِ سجدہ، آگ ہی باغِ بہاراں تھی!
آگ کے کھوج میں خاک پیمبر، ایسا ہی تیرا کھیل رہا!
آگ مغانِ کہن کی بجھی، جب ایک تجلّی انساں تھی!

''آبیار'' میں پانی کی بے رنگی کو رب کی شکل وصورت سے ماورائی سے مماثل قرار دیتے ہیں۔

مختار صدیقی کا تاریخی وعصری شعور بے مثال ہے، وہ نظم کے کسی ایک مصرعے میں ہی، تلمیحات قائم کر کے عہد درعہد کی داستان رقم کر دیتے ہیں۔ کہیں وہ آب کو ''سّم'' کہیں زمزم، تو کہیں موجۂ کوثر کی مثالیں دیتے ہیں۔ ''آ'' کی ذیل میں آخری قطعے میں اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

آب، رواں تنور سے ہو تو ہفت اقلیم بھی پانی پانی
آب، وہ سوتے، جن کے فیضان مونسِ ضربِ کلیم رہے!
آب، وہ چشمۂ حیواں، جس سے لوٹنے پر بھی سکندر فانی
آب، شہادتِ حق کا بھی حیلہ، آب رُکے اور خون بہے!

''آج ملے......وصال'' کے موضوع پر بھی متفرق خیالات کا اظہار کیا۔ ابتداء میں قرۃ العین طاہرہ کا شعر درج کرتے ہیں:

من و وصلِ آں مہ خوبرو کہ جو شد صدائے بلیٰ، برو
بہ نشاط و قہقہہ شد فرو کہ اَنا الشہید بکربلا

ترجمہ:

مختار صدیقی نے تصوف کے فلسفے کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ ''وصال'' کو مجاز کے معنوں میں بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ محبوب کے طرزِ تغافل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کی کج ادائیوں کا بھی۔ یہ ان ہی کا رنگِ خاص ہی ہوسکتا ہے کہ کہیں وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بھید کھولتے نظر آتے ہیں اور کہیں زندگی کی دنیاوی رنج و راحت کو بھی موضوع بنا لیتے ہیں۔

''بول'' کے موضوع پر تین قطعات لکھتے ہیں جس کی ابتداء میں فانؔی کا ایک مصرع درج کرتے ہیں کہ ''یہ انس و ملک، یہ جسم و جاں ہیں الفاظ'' باقی تمام قطعات اس کی توضیح نظر آتے ہیں۔ اختتام اس مصرعے پر کرتے ہیں:

ع ''بول کٹاریں، بول ہی مرہم ...... مورکھ ہم جو بولیں بول''

> موضوعات کے اعتبار سے اس میں جو رنگا رنگی ہے...... اس کا جائزہ لیا جائے اور محاکمہ کیا جائے اور اس کا تشخص کیا جائے۔ اس فکری اور محاسباتی عمل نے، جو باتیں زندگی کی مختلف واردات کے بارے میں سجھائیں وہ نظم کی گئیں تا کہ اپنی شخصیت کے اجزا کے ربط اور یک آہنگی "Integration" کے لیے کوئی سامان بہم پہنچے۔''(۱۵)

موضوعات میں تنوع، مشاہدات میں جو وسعت، اظہار میں جامعیت، اس شعری مجموعے کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن فلسفے کے باوجود شعری آہنگ میں جو موسیقیت اور ترنم کا عنصر بدرجہ اتم قائم رہتا ہے۔

''آثار'': باقیاتِ مختار صدیقی

''آثار'' ۱۹۸۸ء میں ہارون مختار کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آیا۔ اس میں مختار صدیقی کے غیر مطبوعہ کلام کو شامل کیا گیا۔ اس کا پیش لفظ ضیاء جالندھری نے لکھا جس میں مختار صدیقی کی شاعری کا بڑے تفصیلی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ ضیاء جالندھری جیسے صاحبِ نظر شاعر مختار صدیقی کے شاعرانہ سلیقے کی داد دیے بغیر نہ سکے:

> ''مختار کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ وہ نظم کی ساخت اور ڈھانچے کی تعمیر بہت احتیاط اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ اپنے مزاج کا رچاؤ اور رَس وہ ایک ایک مصرعے میں سمو دیتے ہیں۔ انا اور مذہبی تجربات کا بھی اظہار ملتا ہے۔''(۱۶)

''آثار'' میں مختار صدیقی کا فن اپنی پوری تابانی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ بے نیازی کا منظر بھی پیش کرتا ہے۔ جہاں مختار صدیقی، ہیئتوں اور موضوعات کے لیے راگ راگنیوں کے تجربے کرتے ہوئے ایک محتاط مگر مشاق شاعر کی طرح جلوہ گر ہوتے ہیں وہ انداز ''آثار'' میں مختلف انداز اور رنگوں میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ غزلیات اور نظموں دونوں پر مشتمل ہے۔

مختار صدیقی بیک وقت کلاسیکی بھی ہیں اور جدید بھی۔ ان کے اِس امتزاج سے ان کی شاعری نے جلا

پائی۔ اس ہنر کے ن م راشد اور ضیاء جالندھری دونوں معترف ہیں:

''مختار صدیقی یوں بھی جدید شاعروں میں سخت قدیم شاعر ہے۔ اپنے نئے نئے تجربات اور اپنی اُن ڈرامائی نظموں کے باوجود...... وہ سخت قدیم شاعر ہے۔''(۱۷)

ضیاء جالندھری تو ان کی کلاسیکیت کے اس حد تک قائل ہیں کہ غزل کے نئے ہیئتی تجربات کے باوجود وہ انھیں فکر و خیال میں میرؔ کا مقلّد سمجھتے ہیں:

''مختارؔ جیسا کلاسیکی ادب کا گرویدہ غزل سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا تھا۔ مختار نے غزل کہی اور کئی ڈھب سے کہی...... پھر ایک زمانے میں انھوں نے میرؔ کی پیروی میں بھی غزلیں اور طرزِ میرؔ اختیار کیا۔''(۱۸)

میرؔ کے رنگ تغزّل کا مختار صدیقی کے فن پر اثرات کا جائزہ نظیر صدیقی ان الفاظ میں لیتے ہیں:

''میرؔ کا رنگ اختیار کرنے والوں میں غالباً مختار صدیقی سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ نہیں ہے کہ ان کی غزلوں میں وہی دل شکستگی، دل گیری، خودداری، گوشہ گیری، فقیر منشی، حزن و حسرت، صبر و ضبط اور حلاوت آمیز تلخی پائی جاتی ہے، جن سے میرؔ کی غزلوں کی مغنا عبارت ہے بلکہ یہ کہ انھوں نے بعض بڑے گہرے ذاتی تجربات و مشاہدات کو میرؔ کے لہجے میں بیان کیا ہے۔''(۱۹)

''آثار'' میں سات غزلیات شامل ہیں۔ ان غزلوں میں جہاں ہیئت کے نئے نئے تجربات ہوئے ہیں وہیں سوز و گداز کا رنگ کلاسیکی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی غزل غم جاناں سے زیادہ غم دہر کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کی شاعری کے استعاروں کو فیض احمد فیضؔ کی طرح ملک کے ٹوٹنے اور ابتری کے حالات کی داستان بیان کرنے کے لیے بھی استعمال کیا ہے:

آثار کی نظمیں: تجزیاتی مطالعہ

'آثار' میں مختار صدیقی کی نظم نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کی پختہ فکری اور شاعرانہ تخیل مل کر قاری کو کئی ایک نئے عالم وجہ میں لے جاتی ہے۔ لفظوں کی کاریگری اور پوشیدہ موسیقیت ان نظموں میں مخفی گہرے فلسفے کو بڑی تازگی عطا کرتی ہے۔ ان کی ''آثار'' میں شامل پہلی نظم ''لہریں'' طویل نظم ہے۔ اس میں لہروں، سمندر اور بھنور کے استعاروں سے وقت کی اضطراری کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ وقت اور سمندر کی لہریں ہر تہذیب کا، ہر فاتح کا اور ہر مفتوح کا آخر کار نشان مٹا دیتے ہیں اور پھر وقت کی صدیوں کی لپیٹ میں لپٹا ہوا محض ماضی رہ جاتا ہے یا پھر اس سے جڑی ہوئی داستانیں۔ انہی داستانوں کا بیان مختار صدیقی، ہر بند میں ماضی کی بازیافت کی کوشش کرتا ہوا نظر

آتا ہے:

اب وہ آبادیاں ...... بَن ہو گئی ہوں گی کہ جہاں!
ہم جہاں بین و جہاں گیر تھے ...... صدیوں کی قسم
عہد در عہد، وہ صدیاں ہوئیں زندہ مجھ میں!
جن میں ہم کارکُن و کارکشا تھے پیہم

وقت کے ہاتھوں وہ صرف عمارتوں کے کھنڈرات بننے پر ہی انگشت بدنداں نہیں ہیں بلکہ وہ ایسے لوگوں پر بھی حیف کرتے ہیں جو حُسن کو گردش ایّام پر بھی حاوی مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ''وقت جیسے ہو اِسی ماوشی کا چاکر'' اور اس پر خدا کو بھی قادر نہیں مانتے۔ مگر اگلے بند میں کئی حسین چہروں کی، ان کی اداؤں کی، ان کی تقافل و مہر کی داستانوں کا بیان کرتے چلے جاتے ہیں مگر اسی تسلسل میں جاری بحث کو اچانک اس طور سمیٹتے ہیں کہ حال، ماضی میں بدل جاتا ہے۔

نظم آگے بڑھتی جاتی ہے اور شاعر کی فکر کی بلندی اُسے مدائن کے کھنڈرات اور مسجد قوت الاسلام کے قطب سیاروں سے اُٹھتی ہوئی تکبیر کی تونج جیسے مناظر عیاں کرتی جاتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں ہندوستان میں دکنی ریاستوں کی داستان ان کے تخیل سے ماضی کے اوراق پر اُبھرنے لگتی ہے۔ دکنی ریاستوں کے عروج وزوال کی کہانی کو ماضی سے حال میں یوں بیان کرتے ہیں کہ انہیں الفاظ کی اصوات سے نئے معانی اور مفاہیم پیدا کرنے میں دیر نہیں لگتی:

بیجا پور آج ہے بے جا، تو ہے بیدر، بے در
اور ...... گلبرگہ ہے بے برگ و نوا و برباد!

نظم کا تیسرا حصہ ان کی تمام دلیلوں کا احاطہ کرتے ہوئے بہت سے حقائق کا تجزیہ کرتا ہے۔ نظریۂ وقت کو لہروں کے بھنور میں سے ایسے اخذ کرتے ہیں کہ قاری حیرت سے باہر نہیں آپاتا اور وہ تاج محل کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے اکبرآباد کے قلعۂ الوند کی تمکنت اور جلال تک جا پہنچتے ہیں اور پھر وہ تاج محل میں گزری ایک چاندنی رات کا نقش اجاگر کرتے ہیں، جس میں دو ابدی محبت کرنے والے لوگ محو گفتگو ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''دورِ زماں کچھ بھی نہیں'' اور پھر گفتگو میں مکالماتی انداز اپنایا گیا ہے۔ ڈرامائیت جو مختار صدیقی کا بنیادی وصف ہے، وہ اس حصے میں نمایاں ہے۔ محبت کی ابدیت کو اس طور بیان کرتے ہیں:

یورشیں کر کے، امنڈ آئیں گی سونی شامیں
لاکھ بھٹکیں، کسی عنواں نہ سویرا ہو گا
کیسی رُت آئی ، ہوا چلتی ہے ......جی ڈولتا ہے
اب تو ہنسنا بھی تڑپنے کا بہانہ ہوگا

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

ذرّے زندانِ ملامت بھی ہیں ویرانوں کے
دَر بَنا کرتی ہیں دیواریں ہی زندانوں کی

''آ ثار'' کی غزلیں اپنی جگہ موضوعات کے لحاظ سے الگ ایک گہرے مطالعے کی طالب ہیں۔ ان کی غزلوں میں عصری شعور اوراس کا درد بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ نہ صرف سیاسی وسماجی حالات کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ انہوں نے عالمگیر مسائل کی طرف بھی توجہ دی:

علم نے خیر نہ چاہی، کبھی انسانوں کی
ذرّے برباد یونہی تو نہیں ویرانوں کے!

مندرجہ بالا شعر میں علم کی تباہ کاریوں کا بڑے سلیس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ غزل جیسی صنف میں جہاں انہوں نے ہیئتی تجربات کیے وہاں ایک جدّت اور تنوع موضوعات کے چناؤ میں بھی پیدا کی۔ الفاظ کا انتخاب بہت سادہ، رواں اور جامع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ابلاغ میں قیمت نہیں ہوتی۔

''آ ثار'' میں غزلیات کے ہیئتی تجربات کا رنگ پہلی اور پانچویں غزل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلی غزل میں ہی وہ قوافی کا ایک نیا نظام کرتے ہیں جب غزل کے دونوں مصرعے بعض اشعار میں ہم قافیہ ہیں۔ مثلاً:

پھیرا بہار کا، تو برس دو برس میں ہے
یہ چال ہے خزاں کی، جو رُک رُک کے تھم گئی
شاید کوئی اسیر ابھی تک قفس میں ہے!
پھر مَوجِ گُل، چمن سے جو با چشمِ نم گئی
قبضے میں جوشِ گُل ، نہ خزاں دسترس میں ہے
راحت بھی کب مِلی ہے، اگر وجہ غم گئی

عہد در عہد ...... اسی طور، دلوں کی باتیں
عکس اپنا ، اسی آئینے میں دیکھا کی ہیں
اور خوں گشتہ تمنائیں، ہر اک سینے میں
دل کے ہر داغ کو اک تاج بنایا کی ہیں

محبت کی داستان ہو یا طاقت کی نمائش اور ان دونوں پر وقت کی ظلمت، یہ سب موضوعات مختار صدیقی نے نئے نئے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ وہ بحرِ وقت میں، یہ سب بستیاں، محلات، قلعے خس و خاشاک کی طرح بہنے لگتے ہیں اور شاعر کا ماضی اس کے مستقبل سے سوال کرتا ہے کہ آج تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں ''ع: تو ہے مشکوک، تو بوسیدگیٔ دوش ہوں میں!'' جس کے جواب میں ''مستقبل'' کہتا ہے کہ تم (ماضی) اور میں دونوں ہی حال کے محتاج ہیں اور پھر ماضی، حال اور مستقبل ایک صورت اختیار کر لیتے، حجاب اُٹھتے جاتے ہیں، فرد کی اہمیت کا ادراک شروع ہوتا ہے:

ع محورِ حال میں مَیں ہی ہوں، اور جادۂ آئندہ بھی مَیں!

اگلے بند میں کہتے ہیں کہ:

نظم میں فلسفۂ وقت کو بڑے عمدہ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ مختار صدیقی نے صدیوں کی تہذیب کو ابھرتے اور ڈوبتے ایسے دکھایا ہے کہ سب پر وقت کی حکمرانی کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا مگر آخری بندوں میں انہوں نے بہار کی آمد کو امید کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔

''آثار'' میں دوسری نظم ''خیال الّیا بلاول'' موضوع اور ہیئت دونوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں موت اور وحدت الوجود کے فلسفے سے بحث کی گئی ہے کہ کس طرح انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر وقت، رنگینی اور بہار کے ساتھ ہر موسم اپنے تغیرات کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ مختار صدیقی ''انترہ''☆، ''بہلاوہ'' کے طور پر نظم کے پھر ذیلی عنوانات قائم کرتے ہیں اور آخر میں اپنی اصل بات کی طرف ایسے اشارہ کرتے ہیں کہ قاری پر نئے جہانِ معنی افشا ہو جاتے ہیں:

لب شکوہ ستاں، شکر کناں ہو کے، نوا بار ہوئے ہیں: یَا ھُوْ
ہم میں وہ......اس میں ہیں گم ہم، تَتَنَا ہُوْ، یَا ھُوْ

اور اسی ''ھُوْ'' کے ہیں اسرار، جہاں ہیں وہ لوگ!

نظم کی ہیئت اور موسیقیت دونوں اس کو گیت کے زیادہ قریب کر دیتی ہیں۔ ''نزعِ مسلسل'' میں ای کا یسی عورت کا دُکھ بیان کیا گیا ہے جسے بیوگی کا دُکھ سہنا پڑتا ہے۔ اس نظم میں وہ کوئی اصلاحی پیغام نہیں دے رہے بلکہ ایک خاموش دکھ، جو اس عورت کی روح میں حلول کر گیا ہے اور اس کی زبان گنگ ہو چکی ہے اور سماج نے خود ہی خود، اس سے زندگی کے تمام رنگ چھین کر اس پر گورتک دکھوں کی کالی چادر ڈال دی ہے، کا بیان ملتا ہے۔ اُس عورت کی خاموشی، اس جشن پر بھی اُسی طرح قائم تھی جسے زمانے نے شادی کا نام دے کر اُسے غیر کو سونپنا چاہا تھا، جسے وقت نے ''خوابِ پریشاں'' کی طرح بکھیر دیا اور اس کے حصے میں نزعِ مسلسل آئی اور نظم کے آخر میں ایک خود کلامی کی فضا ملتی ہے، جس میں وہ عورت اپنے خوابوں کے سرابوں میں بھٹک رہی ہے۔

رنگ ہی رنگ ہیں!
ان میں کوئی صورت نہیں ملتی، جسے جان سکیں!
وہ تناسب، وہ تیقّن، وہ تعیّن نہیں
ہم جس سے شناسا ہوں
جسے مان سکیں!

عورت کے ساتھ استحصالی روّیوں کے خلاف علم بغاوت، بڑے گہرے اور پرتاثیر انداز میں بلند کیا گیا ہے۔ مختار صدیقی کی نظم ''میرے شب و روز'' مقبوضہ کشمیر کے حالات کے تناظر میں لکھی گئی ہے جس میں مہاجنوں کے ہاتھ، بکتی ہوئی مجبوریاں، دہکتے ہوئے چنار اور بے گور و کفن نوجوانوں کے لاشوں کو موضوع بنایا گیا ہے:

لالہ زاروں میں بنی، لالہ رُخوں ہی کے لہو سے دلدل
جبر کی آگ سے دوزخ ہیں چنار
اور ہر اک کوہ و دَمن
موت کے سکرات میں ہے
کیا کہیں، وادیٔ کشمیر، عجب وقفۂ حالات میں ہے!!

''میرے شب و روز'' میں مختار صدیقی کا گہرا عصری شعور نمایاں ہے۔ ''آثار'' میں پہلا تابلو☆، دوسرا تابلو، تیسرا تابلو اور چوتھا تابلو کے عنوان سے مناسک حج کے دوران طاری ہونے والی کیفیات کو گہری معنویت سے پیش کیا۔ اس طویل نظم میں ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں مثلاً ''عرفات''، ''مزدلفہ کی رات''، ''طواف'' اور الوداعی طواف اور گنبدِ خضریٰ کے انوار کے بارے میں سعی صفا و مروہ میں جب وہ حضرت ہاجرہ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا دلنشیں شعر کہتے ہیں کہ اس کی تاثیر روح پر براہِ راست اثر ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے کہا کہ ''حج، ہاجرہ ہے'' مختار صدیقی کی عقیدت بھی اس سے ایسے ہی شعر

کہلواتی ہے کہ:

ایک ماں تھی۔ جو انہی ٹیلوں میں دوڑی تھی
کہ مل جائے ذرا سا پانی!

....

آ خرینش کی گواہی پہ اب
اور جنم دان کی یہ شرط ہے اب
جو بھی زمانے ہوں......وہ دنیاؤں کی حد تک دوڑیں
صدیاں مائیں بہنیں......اور ابد تک دوڑیں!

ان کی ایک اور طویل نظم 'کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی' محبت کے کئی مقامات کو شاعرانہ پیرائے میں سموتی ہے۔ اس نظم میں انسان کی محبت کے لمحات کو صفحات پر منقش کرنے کی کامیاب کوشش ہی نہیں ملتی بلکہ انسانی جذبات اور روحانی پاکیزگی کی کشاکش کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظم معریٰ ہے۔ 'برسی'، 'دستۂ گل'، 'میری راہوں پہ'، 'انا کی قندیل'، 'جانے والے سے'، بھی ''آثار'' میں شامل ہیں۔ یہ نظمیں، مختار صدیقی کی فنی و فکری پختگی کی دلیل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ن۔م راشد،س۔ندارد،۔''مختار صدیقی کی سی حرفی۔''،مشمولہ مجلّہ،شیر وحکمت،ن۔م راشد نمبر،۳۴۴

۲۔ صفدر میر،مشمولہ بیابانِ جنوں،ص ۲۶

۳۔ مختار صدیقی،۱۹۵۵ء،بشنواز ے نئے ،مشمولہ مَنزلِ شب ص ۱۲

۴۔ ایضاً،ص ۱۳

۵۔ صفدر میر،مشمولہ بیابانِ جنوں،ص ۲۶

۶۔ 'طاہرہ جبیں،ص ۲۷

۷۔ پروفیسر فتح محمد ملک،۱۹۹۱ء،مختار صدیقی کا فردآشوب،،مشمولہ تعصّبات،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،ص ۳۱۱

۸۔ افضل پرویز صاحب، انٹرویو راولپنڈی مورخہ ۲۶ رجون ۱۹۹۴ء بحوالہ طاہرہ جبیں،مختار صدیقی کی نثر نگاری،مقالہ برائے ایم۔فل،علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،اسلام آباد،ص ۱۱

۹۔ مختار صدیقی،بشنواز ے نئے ،مشمولہ منزلِ شب،

۱۰۔ ن م۔راشد''مختار صدیقی کی سی حرفی''ص ۳۴۵

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ 'مختار صدیقی،حرفِ آغاز مشمولہ سی حرفی،،ص ۹

۱۳۔ ن م۔راشد''مختار صدیقی کی سی حرفی''ص ۳۴۵

۱۴۔ مختار صدیقی،حرفِ آغاز مشمولہ سی حرفی،،ص ۶

۱۵۔ مختار صدیقی،حرفِ آغاز مشمولہ سی حرفی،،ص ۷

۱۶۔ ضیاء جالندھری،فروری ۱۹۸۸ء،پیش لفظ آثار،،لاہور،ماوراء پبلی کیشنز،ص ۱۱

۱۷۔ ن م۔راشد،مختار صدیقی کی سی حرفی،ص ۳۴۴

۱۸۔ ضیاء جالندھری،فروری ۱۹۸۸ء پیش لفظ آثار،لاہور،ماوراء پبلی کیشنز،ص ۱۱

۱۹۔ نظیر صدیقی،۱۹۸۴ء جدید اُردو غزل۔۔۔ایک مطالعہ،لاہور،گلوب پبلی کیشنز،ص ۱۵۱

حواشی

مختار صدیقی احوال وآثار

یکم مارچ ۱۹۱۹ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء میں اور حلقے کی رکنیت ۱۹۴۰ء میں اختیار کی حلقہ ارباب ذوق کے اہم فعال رکن تھے،ان کی شاعرانہ حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اس کے علاوہ ان کی تخلیقی ذہن کی کئی جہتیں ہیں جن کا اظہار وہ نظم ونثر دونوں کرتے ہیں۔وہ نثر میں بحیثیت نقاد ،مترجم،ڈرامہ نگار کے طور بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے،تصوّف اور موسیقی سے خاص لگاؤ رکھتے تھے،انہوں نے نظم کی ہیت پر کلاسیکی موسیقی کے سرتال کے کئی کامیاب تجربے کیے۔عمر کے آخری حصے میں،سی حرفی کی صورت اپنے متصوّفانہ رجحان کا اظہار کیا۔۱۸ستمبر۱۹۷۲ءکو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

<u>بلمپت لے</u>

طبلے کی مدھم لے کو بلمپت لے کہتے ہیں

<u>دُرت</u>

طبلے کی تیز لے کو درت کہتے ہیں۔

<u>کیدارا</u>

چاندنی رات کا راگ

<u>تابلو(Tableau)</u>

تابلو کسی کہانی یا واقعے کی خاموش اداکاری ہوتی ہے۔

<u>اَنترہ</u>

گانے کا وہ حصہ جو ہر بند میں بدل جاتا ہے

<u>اَستھائی</u>

گانے کا شروع کا حصہ جو دہرایا جاتا ہےس کو مکھڑا بھی کہتے ہیں

<u>راگ</u>

سروں کی ایسی بندش جو ایک خاص کیفیت پیدا کرے وہ راگ کہلاتی ہے۔

<u>رَس</u>

کلاسیکی موسیقی دن رات کی مختلف گھڑیوں میں مختلف بندشوں اور مختلف تاثر (یعنی راگ) کی قائل

ہے۔اس نظریے کے مطابق ہر راگ راگنی اپنے مناسب وقت پر ہی وہ تاثر پیدا کر سکتی ہے جس کے لیے اُسے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ تاثر، رَس کہلاتا ہے۔

سی حرفی

یہ ایک پنجابی صنفِ سخن ہے، یہ عموماً اخلاقی، مذہبی اور صوفیانہ مضامین کے اظہار پر مشتمل ہوتی ہے۔ پنجابی شاعری میں ابجد کے تیس حروف سے چار چار بندوں سے آغاز کیا جاتا ہے۔مجموعی تعداد تیس یا اس سے زائد بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلا بند حرف الف سے اور اختتام ی کے حرف پر ہوتا ہے۔مختار صدیقی نے اس صنف کو اُردو میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔

کتابیات

۱۔ صفدر میر، نومبر ۱۹۹۷ء مشمولہ بیابانِ جنوں، مرتبہ، شیما مجید، لاہور، کلاسیک ریگل چوک

۲۔ طاہرہ جبیں، ۱۹۹۳ء مختار صدیقی کی نثر نگاری،، مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۳۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، ۱۹۹۱ء، مختار صدیقی کا فرد آشوب،، مشمولہ تعصّبات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز

۴۔ مختار صدیقی، ۱۹۵۵ء، منزلِ شب، لاہور، سویرا آرٹ پریس

۵۔ مختار صدیقی، ۱۹۶۳ء، سی حرفی، کراچی، گولڈن بلاک ورکس

۶۔ مختار صدیقی، فروری ۱۹۸۸ء، پیش لفظ آثار،، لاہور، ماوراء پبلی کیشنز

۷۔ نظیر صدیقی، ۱۹۸۴ء جدید اردو غزل ۔۔۔ ایک مطالعہ، لاہور، گلوب پبلی کیشنز

۸۔ ن۔م راشد، س۔ندارد، ''مختار صدیقی کی سی حرفی''، مشمولہ مجلّہ، شیر و حکمت، ن۔م راشد نمبر